ڈاکٹر محمد حمیداللہؒ

* سید ضمیر جعفری

[سید ضمیر جعفری (۱۹۱۶ء۔۱۹۹۹ء) اُردو ادب کے معروف مزاح نگار، ادیب، شاعر اور کالم نویس تھے۔ چک عبدالخالق (جہلم) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں گورنمنٹ کالج اٹک سے انٹر اور ۱۹۳۸ء میں اسلامیہ کالج، لاہور سے بی۔اے کیا۔ زمانہ طالب علمی میں ''مشعل''، ''مجلّہ گورنمنٹ انٹر کالج اٹک'' اور کریسنٹ (مجلّہ اسلامیہ کالج لاہور) کے مدیر رہے۔ ابتداء میں آپ کا قلمی نام درد جعفری تھا۔ بعد میں ضمیر تخلص کرنے لگے دوسری جنگ عظیم میں فوج میں کیپٹن ہو گئے۔ آپ کی چند مشہور کتب میں ''جزیروں کے گیت، مافی الضمیر، اڑتے خاکے، ضمیر حاضر، ضمیر غائب، ارمغان ضمیر کتابی چہرے، آپ کا ضمیر، ہندوستان میں دو سال'' ہیں۔ سید ضمیر جعفری علاج کی غرض سے امریکہ گئے اور وہاں ڈاکٹر محمد حمیداللہؒ سے ملاقات کی اور اس ملاقات کے تاثرات ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، نومبر ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئے مذکورہ مجلّے کے شکریے کے ساتھ یہ تاثرات شائع کر رہے ہیں۔ (مدیر)]

آج اپنی زندگی کی ایک بڑی دیرینہ اور عزیز خواہش پوری ہوئی، اپنا ایک کبھی کا کہا ہوا مصرع بھی یاد آ گیا۔

ملاقات ان سے کہاں ہو گئی ہے

عصر حاضر کی بہت محترم، ممتاز، یگانہ و منفرد شخصیت، مفکر و مفسر جناب ڈاکٹر محمد حمیداللہ کی خدمت میں حاضری کی آرزو ایک مدت سے دل میں کسمسا رہی تھی، چند برس قبل پیرس میں ان کے دروازے تک بھی جا پہنچے مگر یہ سعادت تو ہمارے لیے امریکہ میں لکھی گئی تھی۔ زندگی کے اتفاقات کتنے عجیب ہیں کہ ہمیں یہ بھاگوان ساعت جناب حضرت علی کی وساطت سے نصیب ہوئی جو بے شک ایک خوش کلام شاعر ہیں مگر ان کی عالمی شہرت ایک سائنس وان کی ہے اور سائنس دانوں کے بارے میں عموماً یہ باور کیا جاتا ہے کہ 'دین' سے ان کو کم ہی رغبت ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے اندر کا ''شاعر'' ہمارے کام آ گیا۔

جناب حضرت علی، نیویارک سے تقریباً ایک سو میل دور ''کنیکٹی کٹ''(Connecticut) ریاست کے ایک قصبے میں رہتے ہیں۔ ''مشاعروں'' کے علاوہ ٹیلی فون پر بھی گاہ بگاہ ان سے رابطہ رہتا ہے۔ ایک روز نہ جانے کس حوالے سے انہوں نے اس جلیل القدر شخصیت سے اپنی ملاقات کے تذکرے میں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب ان دنوں امریکہ کی ریاست ''پینسلوینیا''(Pennsylvania) کے چھوٹے سے قصبے ولکیز بارے (Wilkes Barree) میں اپنے بڑے بھائی کے پوتے کے پاس مقیم ہیں۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے حضرت علی سے کہا:

''جانِ من مجھے ان کی بارگاہ میں لے چلو۔''

حضرت نے کہا:

''وہ علیل ہیں۔ بہت نحیف ہو گئے ہیں۔ گھر والوں نے ملاقاتیں محدود کر رکھی ہیں۔
بہرحال کوشش کروں گا۔''

میں نے کہا:

''کوئی صورت پیدا کرو کہ میں ان کی صورت ہی دیکھ لوں۔''

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا شمار عالم اسلام کے چند جلیل القدر مفکرین میں ہوتا ہے، مگر ان سے میری ذاتی ارادت کا سرچشمہ ڈاکٹر صاحب کے دو ارادت مندوں اور اپنے کرم فرماؤں (پاکستان کے نامور سندھی اسکالر) جناب پیر حسام الدین راشدی اور (ممتاز ادیب و دانشور اور ''اسٹیٹ بینک آف پاکستان'' کے گورنر) جناب ممتاز حسن کی باتیں تھیں۔ فرانسیسی زبان میں ڈاکٹر صاحب کا قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر تو ایک عظیم الشان اور غیر فانی علمی کارنامہ تھا ہی، یہ دونوں حضرات ڈاکٹر صاحب کی ذاتی زندگی کے سادہ اور درویشانہ اسلوب سے بھی بے حد متاثر تھے۔ ان کی رائے میں مغرب میں اسلام کی ترویج و تفہیم کی پیش رفت میں جو مدد قرآن کریم کے اس فرانسیسی ترجمے سے ملی ہے، کسی اور ذریعے سے ممکن نہ ہوئی۔ ان کا کہنا تھا کہ ابلاغ کی ادبی خوبصورتی کے حوالے سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے فرانسیسی ترجمے کی وہی اہمیت و مقبولیت ہے جو علامہ عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمے کو نصیب ہوئی ڈاکٹر صاحب کے بارے میں یہ بات تو معلوم تھی کہ ان کا تعلق حیدر آباد سے تھا، مگر ان کے خود اختیاری ''بن باس'' کا علم ممتاز حسن صاحب ہی سے ہوا کہ برصغیر کی آزادی کے بعد جب

بھارت نے حیدر آباد (دکن) کی خود مختاری کو غصب کرنا چاہا تو نظام دکن نے جو وفد مجلس اقوام متحدہ میں اپنا موقف پیش کرنے کے لیے امریکہ بھیجا اس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھی شامل تھے، مگر یہ وفد ابھی راستے ہی میں تھا کہ بھارت کے جنرل جے انت ناتھ چودھری نے ریاست ہی کو روند ڈالا اور

''وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا''۔

ڈاکٹر صاحب اس سفر پر ایسے نکلے کہ پھر انہوں نے حیدر آباد واپس جانا پسند ہی نہ کیا اور پیرس ہی میں مستقل مقیم ہو کر علمی کام میں مصروف ہو گئے۔ پاکستان میں ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے یہ بات بھی عام سننے میں آئی کہ جنرل ضیاء الحق نے اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں ان سے مشورہ کیا اور بہت بڑی رقم بھی ان کی خدمت میں پیش کی۔ اس مردِ قلندر نے مشورہ تو دیا مگر رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ہم ڈاکٹر صاحب کی عظمت کے ''ہالے'' میں پہلے بھی تھے مگر اس کا تصرف مزید اس وقت گہرا ہوا جب (ممتاز محقق و مصنف) ڈاکٹر افضل اقبال مرحوم کینیڈا میں پاکستان کے سفیر کے منصب سے سبکدوش ہو کر راولپنڈی میں مقیم ہوئے اور ان سے قریبی ربط وضبط کا سلسلہ قائم ہوا۔ یہ اپنی ذات اور کتابوں میں مگن ''باغی شخص''، صرف تین شخصیتوں کا ''مرید'' تھا۔ مولانا جلال الدین رومیؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ ڈاکٹر افضل اقبال جن دنوں برطانیہ میں ڈپٹی ہائی کمشنر تھے، پیرس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے ''اسلامک سنٹر'' میں آتے جاتے رہتے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ مولانا (ڈاکٹر صاحب) کی تصنیفات صرف فرانسیسی زبان میں تھیں مگر ان کے ثمرات تو فرانسیسی کے علاوہ انگریزی، جرمن اور ترکی زبانوں میں بھی موجود ہیں۔ ان زبانوں میں آپ کی چند تصانیف ڈاکٹر افضل اقبال کے وسیع ذاتی کتب خانے میں بھی موجود ہیں۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے جہاں مرشد رومی اور مولانا محمد علی جوہر پر معرکہ آراء کتابیں لکھی ہیں، وہاں ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی عظیم فکر انگیز تصنیف ''خطباتِ بہاولپور'' کا انگریزی ترجمہ بھی افضل اقبال کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ وہ جن دنوں ''خطباتِ بہاولپور'' کا ترجمہ کر رہے تھے، ایسا لگتا تھا جیسے وہ شخص ڈاکٹر حمید اللہ کے افکار میں زندگی گزار رہا ہو۔

امریکہ میں ڈاکٹر صاحب کے جغرافیائی قرب نے دل میں ایک کرب کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ بے چینی اپنا کام کر گئی۔ کل ''کنیکٹی کٹ'' سے حضرت علی صاحب نے ٹیلی فون پر بشارت دی:

''کل سرِشام ساڑھے آٹھ بجے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب سے ملاقات کا وقت مقرر ہوا ہے۔آپ کے گھر سے دو بجے روانہ ہوں گے۔''

''لانگ آئی لینڈ'' (Long Island) میں ہمارے گھر سے ''ولکیز'' تک اور پھر وہاں سے ''کنیکٹی کٹ'' میں جناب حضرت علی کے گھر تک ہم نے آج تقریباً دو سو میل سے زیادہ سفر کیا۔خوش منظری کا بیان اس وقت مقصود نہیں۔اتنا کہنا کافی ہے کہ ہم امریکہ جا رہے تھے اور امریکہ کے پہاڑی علاقے میں جہاں آسمان کا حسن زمین پر اتر آتا ہے وہی عالم کہ:

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

قصبے میں حضرت نے جس مکان کے سامنے موٹر روکی اس کو دیکھ کر دل کو دھچکا سا لگا۔مجھے یہ رہائش گاہ عالم اسلام کی اس جلیل القدر شخصیت کے شایانِ شان نہ لگی۔مکان خاصا تھا،مگر دل ان کو کسی عالی شان محل میں دیکھنے کا متمنی تھا۔جذبات کے دھارے میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ ہم کس عظیم الشان درویش کی بارگاہ میں کھڑے تھے۔موٹر کی آواز سنتے ہی ایک ہنس مکھ نوجوان خیر مقدم کے لیے آ گئے،یہ ڈاکٹر صاحب کے پوتے عرفان تھے۔اگلے لمحے ہم گھر کے سادہ سے ''ڈرائنگ روم'' میں محترمہ سدیدہ اور عرفان......دونوں بہن بھائیوں سے باتیں کر رہے تھے۔میز پر سنگترے کے رس کے بھرے گلاس ہمارے سامنے رکھے تھے۔سدیدہ،جو بے حد شائستہ اور بہت تعلیم یافتہ خاتون ہیں،خود کسی دوسرے قصبے میں رہتی ہیں،مگر دادا کی ہمہ وقت تیمار داری کی ضرورت سے بھائی کے ہاں رہتی ہیں۔ڈاکٹر صاحب اوپر کی منزل میں آرام کر رہے تھے۔گفتگو سے معلوم ہوا کہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) سے فارغ ہو کر آپ کئی برس تک فرانس اور جرمنی کی جامعات میں تحصیل علم کرتے رہے۔دوسری عالمی جنگ کا زمانہ وہیں گزارا۔وطن واپس آئے تو سقوط حیدرآباد کا سانحہ پیش آ گیا میرے ایک سوال پر سدیدہ نے یہ بھی بتایا کہ ان کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۱۷۲ ہے۔اس کے علاوہ سینکڑوں کی تعداد میں مقالات اور زیر تصنیف مسودات ہیں جو پیرس کے ''اسلامک سینٹر'' میں موجود ہیں۔کچھ دیر بعد سدیدہ ''دادا'' کو لینے اوپر چلی گئیں۔جاتے جاتے یہ بھی کہہ گئیں کہ ہمیں ان کی طبیعت کے اتار چڑھاؤ کو ملحوظ رکھنا ہو گا۔کچھ کہہ نہیں سکتی کہ وہ کتنی دیر تک بیٹھ سکیں گے۔

وہ اوپر گئیں تو عرفان صاحب سے باتوں میں علم ہوا کہ قصبے میں سارے بھارتیوں اور پاکستانیوں کو ملا کر

گھروں کی تعداد اڑھائی سو سے زیادہ نہ تھی۔ یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ سبزہ وگل سے ڈھکا ہوا یہ علاقہ ''کوئلے کی کانوں'' سے بھرا ہوا ہے۔ اس پر ہمارا اپنا کھیوڑہ (Khewra) کا علاقہ آنکھوں کے سامنے آ گیا جہاں کوئلہ زمین کے اندر بھی ہے اور زمین کے اوپر بھی۔

اتنے میں دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب پوتی کے سہارے آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اتر رہے تھے۔ ہم دونوں نے آگے بڑھ کر تعظیم دی۔ انہوں نے تپاک سے مصافحہ کر کے دونوں ہاتھ سینے سے لگا کر اپنی شفقت کریمانہ کا اظہار فرمایا۔ میں نے اپنے روایتی تسلیمات کے ''کورنش اسلوب'' میں جھک کر ان کے گھٹنوں کو چھونا چاہا تو انہوں نے میرے ہاتھ جھٹک دیے۔ سدیدہ نے بھی منع کیا کہ جھکنا انہیں پسند نہیں، کہیں وہ آپ کو ڈانٹ ہی نہ دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے گاؤن پہن رکھا تھا۔ سر پر ہلکی سی ''جناح کیپ'' تھی۔ چھوٹی چھوٹی خشخشی داڑھی چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھی، مگر وہ بہت کمزور اور لاغر تھے۔ میں نے کسی ''عالم دین'' کو آج تک اتنا ''نحیف'' نہیں دیکھا۔ ان کو دیکھ کر دل کو جھٹکا سا لگا۔ ایک بات پر تعجب بھی ہوا کہ بظاہر ایک ''مشت استخواں'' ہونے کے باوجود چل پھر سکتے ہیں۔ سدیدہ نے بتایا کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک تو مسجد تک ہو آتے تھے، سڑک تک ٹہل آتے، مگر ایک دن مسجد میں گر گئے تو اب گھر سے نہیں نکلتے۔

اس سے پہلے کہ ہم کچھ پوچھتے، آپ نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا ''کوئی خدمت''۔

عرض کیا: ''بس جناب والا کی شفقت درکار رہے۔''

میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر افضل اقبال کے ترجمے کا شاید ان کو علم نہ ہو۔ پہلا سوال ''خطباتِ بہاولپور'' کے ترجمے ہی کا پوچھا۔ آپ نے اثبات میں سر ہلایا۔ سدیدہ نے بتایا کہ کتاب ان کو پہنچ چکی ہے۔ آپ نے اظہارِ پسندیدگی فرمایا۔ یہ خبر بھی انہیں مل چکی تھی کہ ڈاکٹر افضل اقبال کا انتقال ہو چکا ہے۔

میں نے عرض کیا:

> ''حضرت کی خدمت گرامی میں حاضری کی دیرینہ تمنا تھی۔ زیارت سے بے حد خوشی ہوئی۔''

پوچھا: ''فرانسیسی زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر کی تکمیل پر کتنا عرصہ لگا۔''

فرمایا: ''یاد نہیں''

پوچھا: ''کیا آپ نے اپنی ''آٹو بائی گرافی'' تحریر فرمائی ہے؟

فرمایا: ''نہیں''

پوچھا: ''لکھنے کا ارادہ ہے؟''

فرمایا: ''نہیں''

ڈاکٹر صاحب ہر سوال کا جواب ایک دو لفظوں میں دیتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی موجودہ صورت حال میں لمبے لیکچروں کی ان سے توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی لیکن اب ایک سوال ہم نے اپنی دانست میں ایسا پوچھا کہ جواب میں دو چار جملے سننے کی توقع کر رہے تھے۔

پوچھا: ''کیا جنرل ضیاء الحق نے آپ سے پاکستان میں نظام اسلام کے بارے میں استفادہ کیا تھا۔''

فرمایا: ''میں بہت عاجز آدمی ہوں۔''

(آپ نے انگریزی کا لفظ Humble استعمال کیا) سوال جواب کے اس مکالمے میں تجربہ ہوا کہ آپ کی سماعت جتنی دھیمی تھی بصارت اتنی ہی روشن تھی۔ میری لکھی ہوئی تحریر جو میں مشکل سے اٹھا سکتا، وہ عینک کے بغیر پڑھ رہے تھے۔

گفتگو شاید اور چلتی، مگر سدیدہ درمیان میں ''دادا'' سے بار بار پوچھ رہی تھیں:

''آپ کو سردی تو محسوس نہیں ہو رہی؟''

''کمبل لا دوں؟''

''آپ کو نیند تو نہیں آ رہی؟''

''آپ تھک تو نہیں گئے؟''

ڈاکٹر صاحب ''پوتی'' کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دے رہے تھے، مگر آخر جب ایک مرتبہ یہ کہا کہ:

''آپ کا کیا مشورہ ہے۔''

تو ''مزاج دان پوتی'' نے استراحت کا فیصلہ کیا اور جس طرح دادا کو اوپر سے تھام کر نیچے لائی تھیں، اسی طرح تھام کر نیچے سے اوپر لے گئیں۔

جاتے جاتے ان سے ہم نے ایک سوال اور پوچھ لیا؟

''ملت اسلامیہ کے لیے کوئی پیغام۔''

فرمایا:

''اللہ محفوظ رکھے......اللہ بچائے۔''

رخصت کرنے کے بعد سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا:

''کوئی خدمت''؟

اور پھر سیڑھیوں سے چڑھتے ہوئے دیکھتے گئے اور ایک موڑ مڑتے ہوئے ہاتھ ہلا کر ہمیں محبت بھرے اشارے سے نوازا۔

بعد میں کھانے کی میز پر گفتگو میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے کئی دلنواز پہلو سامنے آتے چلے گئے۔ ساری ملاقات میں وہ ہم سے ایک ہی سوال بار بار پوچھتے رہے:

''کوئی خدمت''۔